ایمان اور طمانیتِ قلب[1]

(عبد الحمید صدیقی)

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ یَلۡبِسُوۡۤا اِیۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓئِکَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ۔ (الانعام: ۸۲)

"اہلِ ایمان جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا انہی کے لیے حقیقی امن ہے اور وہی راہِ راست پر ہیں۔"

امن کی یہ بشارت حیاتِ دنیا کے لیے بھی ہے اور موت کے بعد کی ابدی اور لازوال زندگی کے لیے بھی۔ جہاں تک اِس دنیا کا تعلق ہے مومن کو نہ تو امورِ رفتہ کی یاد ستاتی ہے نہ وہ پُرخطر حالات میں گھبراتا ہے اور نہ مستقبل کے اندیشہ ہائے موہوم اسے مضطرب کرتے ہیں۔ زمانہ کے تلخ و شیریں اور گرم و سرد حالات میں وہ کچھ اِس طرح پُرسکون رہتا ہے جیسے جنت میں پُرسکون زندگی بسر کرنے والا۔ طمانیتِ قلب کی یہ متاعِ عزیز کتنی گراں قدر چیز ہے اس کا اندازہ صرف وہ پریشان آدمی کر سکتا ہے جو ہر وقت خوف اور اضطراب کا شکار رہتا ہے۔ ایک دانا سے سوال کیا گیا سرور کیا ہے؟ اور خوشی کا راز کیا ہے؟ اس نے کہا "سکون"۔ کیونکہ محرومِ سکون کے پاس زندگی کے ہزار ساز و سامان بھی موجود ہوں تو اس کی زندگی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔

محرومِ ایمان کا اضطراب اور صاحبِ ایمان کا سکون "میں ایک دائمی خوف میں مبتلا ہوں۔ لوگوں کا خوف، اپنی ذات کا خوف اور دیگر اشیاء و موجودات کا خوف۔ خوف مکمل طور پر میرا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ نہ دولت و ثروت مجھے سکون بخشتی ہے نہ بلند منصب، نہ صحت، نہ عورت، نہ محبت، نہ تفریح کے رنگا رنگ پروگرام۔ ہر چیز کو میں نے آزما دیکھا، کوئی بھی تو میرے لیے سکون بخش ثابت نہ ہوئی۔ آخر یہ خوف مجھ پر کیوں مسلط ہے۔ کیا یہ آلام و افکار کا پیدا کردہ ہے؟ نہیں مجھے کوئی غم لاحق نہیں، نہ کسی بات کی فکر ہے۔ دنیا اور اسبابِ دنیا میں سے ہر چیز میرے پاس موجود ہے۔

[1] یہ مضمون بھی الحیاۃ والایمان سے ماخوذ ہے۔

مال ہے، عزت ہے، تندرستی و توانائی ہے، حسن و جمال ہے پھر خوف کس بات کا ہے؟ کیا اللہ کا خوف ہے؟ نہیں ایسا بھی نہیں اللہ تو میری زندگی سے بالکل خارج ہے۔ پھر خوف کس کا؟ کیا معاشرہ کا؟ لیکن اس کو تو میں سخت ناپسند کرتا ہوں۔ اس سے بیزار ہوں اور اس کا مذاق اڑاتا رہتا ہوں۔ تو کیا میں موت سے ڈرتا ہوں؟ مگر اس کی مجھے پروا نہیں۔ نہ اس کے بارے میں کبھی سوچا ہے۔ کبھی کبھی میں اس لیے بھی خوفزدہ رہتا ہوں کہ اب تو کوئی ایسی چیز نہیں جس کا خوف کھاؤں لیکن بعد میں نہ کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ اور کبھی اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ اس وقت ہر نعمت میسر ہے۔ پھر شاید رہے نہ رہے۔ ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کے باوجود میں سکون سے محروم ہوں۔ سب کچھ پا لینے کے بعد بھی میں بے چین ہوں۔ معلوم حقیقتوں سے نہیں نامعلوم اور مجہول امور سے خائف رہتا ہوں۔ میری بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ میرے خوف و ہراس اور تشویش و اضطراب کی بنیاد خود زندگی ہے" یہ اُس شخص کی قلبی کیفیت جو ایمان سے محروم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس یہ بھی دیکھیے کہ صاحبِ ایمان کے روز و شب کیسے گزرتے ہیں۔

وہ عام حالات تو درکنار انتہائی خطرناک مواقع پر بھی پُرسکون رہتا ہے۔ رسولِ پاک اور حضرت ابوبکرؓ غارِ ثور میں تھے اور کفارِ قریش ان کے تعاقب میں چاروں جانب بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ ڈھونڈ نکالنے والوں کے لیے بڑے بڑے انعامات تجویز کیے جا چکے تھے۔ اس عالم میں چند لوگ تلاش کرتے کرتے ٹھیک اُسی غار کے اُوپر پہنچ گئے جس میں سرورِ کونینؐ اور جنابِ صدیقؓ موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر یہ لوگ اپنے پاؤں کی جانب دیکھیں تو ہم انہیں نظر آ سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی پُرسکون انداز میں فرمایا ابوبکر لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۔ گھبراؤ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے تو ان کی والدہ محترمہ کا خیال تھا کہ بس اب چند ہی لمحوں کے بعد بچہ فرعون کے بے رحم جلادوں کی چھری کے نیچے ہوگا مگر فوراً ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی گئی کہ جب بچے کی جان کو خطرہ ہو تو اسے ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دیا جائے۔ والدہ نے ـــ جی ہاں اُس نومولود بچہ کی والدہ نے سب کام اپنے ہاتھ سے انجام دیئے۔ کمالِ سکون کے ساتھ اور اس ایمان کی بدولت کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اگر ایمان نے حضرت موسیٰ کی والدہ کو طمانیتِ قلب کی بہت بڑی مقدار فراہم نہ کی ہوتی تو وہ بیٹے کو موت کے مُنہ میں جھونکنے پر کبھی تیار نہ ہوتیں۔

ایمان ہی اصل سرچشمۂ امن ہے مومن صرف خدا سے ڈرتا ہے اور یہ ایک ڈر اُسے خوف و بے اطمینانی کے دوسرے تمام حملوں سے محفوظ و مامون کر لیتا ہے۔ اُسے اللہ کے سوا اُس پوری کائنات میں کوئی دوسری طاقت ایسی نظر نہیں

آتی جو اُس کی زندگی اور موت یا نفع و نقصان پر اثر انداز ہو سکتی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مشرک معبودانِ باطل سے ڈراتے تھے مگر خلیل اللہ کا استدلال یہ تھا کہ تمہارے جھوٹے معبودوں سے میں کیوں ڈروں حالانکہ تم شرک کرتے ہوئے سچے خدا سے نہیں ڈرتے۔ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ۔ غور تو کرو فریقین میں سے کون امن کا زیادہ مستحق ہے۔ خدا کے پرستار یا شرک کے علمبردار۔ معلوم ہوا کہ ایمان اور توحید ہی میں امن و سکون کا راز مضمر ہے اور اس کے مقابلے میں کفر و شرک آدمی کے اندر خوف، گھبراہٹ اور بے اطمینانی پیدا کرتے ہیں۔ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ۔ (آل عمران: ۱۵۱) ہم کافروں کے دلوں میں (دوسروں کا) رعب دبدبہ اور خوف ڈال دیتے ہیں۔ اِس لیے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک روا رکھتے ہیں"۔

منکرین اور متشککین کے اندیشے منکرینِ حق کو سب سے زیادہ اضطراب لاحق ہوتا ہے۔ زمانہ اور اس کے حادثات سے، نیز فقر و فاقہ اور بیماری سے وہ ہر وقت لرزہ براندام رہتے ہیں۔ اور موت سے تو اُن کے خوف کا عالم کچھ نہ پوچھیے۔ گویا وہ کوئی خوفناک دشمن یا خونخوار درندہ ہے۔ اخلاقیات کے فلسفی ابنِ مسکویہ نے لکھا ہے: موت سے صرف وہ شخص خوف کھاتا ہے جو حقیقتِ موت کو نہیں سمجھتا۔ نہیں جانتا کہ اُس کی روح کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا بدن مٹی میں مل جائے گا تو اُس کی شخصیت فنا ہو جائے گی مگر یہ عالم باقی رہے گا یا اس خوف کی بنا وہ درد و الم ہوتا ہے جو عالمِ نزع میں آدمی اٹھاتا ہے۔ یا بعد موت کسی سخت سزا و عقوبت کا تصور اُسے دہشت زدہ کرتا ہے۔ یا وہ اس لیے متاسف رہتا ہے کہ ڈھیروں مال جمع کر کے وہ خود خالی ہاتھ دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ بہرحال اِسی قسم کے اوہام کے تحت اس کی زندگی گزرتی ہے جو ہر آن ایک قلق، ایک خوف اور ایک اضطراب سے دوچار رہتی ہے۔

مومن رزق کے معاملے میں مطمئن رہتا ہے دنیا میں انسان کو بالعموم جو چیزیں پریشان رکھتی ہیں ان میں سے ایک رزق کا معاملہ ہے۔ لوگ رزق کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتے؟ حلال و حرام کی تمیز اٹھا دیتے ہیں۔ عزت و ناموس کو داؤں پر لگا دیتے ہیں۔ کسی ایک ذریعۂ روزگار پر انحصار کرنے کے بجائے متعدد ذرائع اختیار کرتے ہیں اور صرف اپنی ذات تک ہی نہیں بلکہ اپنی اولاد و اصغار کے لیے پشتوں تک کا بندوبست کرتے ہیں۔ یوں ہر طرح رزق کا تحفظ کرنے کے باوجود انہیں سکون نصیب نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں اہلِ ایمان ہیں کہ جن کے لیے رزق کا مسئلہ کبھی دردِ سر نہیں بنتا۔ وہ اللہ کی صفتِ ربوبیت و رزاقیت پر ایمان رکھتے ہیں، انہیں یہ ارشاد باری وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود: ۶) فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیتا ہے جب وہ اِس

یقین دہانی کے عین مطابق پرندوں کو آشیانوں میں، درندوں کو جنگلوں میں، مچھلیوں کو سمندروں میں اور کیڑے مکوڑوں کو چٹانوں تک کے اندر رزق پہنچتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اپنے قوی وقدیر خدا کے نظام رزق رسانی پر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اِس اطمینان کا نتیجہ ہے کہ جب ایک مومن کو فرض پکارتا ہے تو وہ شہادت کے ارمان سینے میں پالتے ہوئے میدانِ جہاد کی طرف رواں دواں ہو جاتا ہے درآنحالیکہ وہ اپنی اہلیہ چھوٹے چھوٹے بچوں اور ضعیف والدین کا واحد سہارا ہوتا ہے۔ وہ اُنہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے تو صرف اِس یقین و ایمان کے سہارے کہ ان کا حقیقی سہارا خدا ہے جو اُس سے زیادہ مہربان ہے اور اُس سے بہتر ذرائع پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

مومن موت سے بھی نہیں ڈرتا رزق کے بعد دوسری چیز جس کا لوگوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے موت ہے۔ مگر موت و حیات سے متعلق وہ واضح حقائق جو ایک مومن کے پیشِ نظر رہتے ہیں اگر عام لوگ بھی اُن کا ادراک کرلیں تو شاید موت کی طرف سے وہ کچھ سکون محسوس کریں۔ مومن اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے کہ زندگی کی مہلت اور موت کا ایک وقت معین ہے اس میں کمی بیشی اور تقدیم وتاخیر نہیں ہو سکتی۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (الاعراف: ۳۴)۔ دوسری چیز جسے مومن اچھی طرح سمجھتا ہے یہ ہے کہ موت سے فرار بہر حال ممکن نہیں ہے۔ ہر ذی روح پر یہ گھڑی وارد ہو کر رہنی ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ (آل عمران: ۱۸۵)۔ ایک اور بات جو موت کے خوف کو زائل کر کے رکھ دیتی ہے یہ ہے کہ اس مرحلہ سے گزر کر ہی وہ دارِ فانی سے دار الخلود کی طرف کوچ کر سکتا ہے، ابدی و سرمدی انعاماتِ خداوندی سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور انبیاء و صلحاء کے حضور میں جگہ پا سکتا ہے۔ حضرت یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں کہ موت کو ریب و تشکک میں مبتلا انسان ہی ناپسند کرتا ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو محبّ کو محبوب کے قریب کرنے والی ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک نیک آدمی کا وقتِ موت قریب آپہنچا تو وہ اٹھا غسل کیا خوشبو لگائی اور دو رکعت نماز ادا کرنے لگا۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد جب لوگ اس کے قریب گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ قبلہ رُخ پڑا ہے اور اس کی رُوح پرواز کر چکی ہے۔ اس کے سر کے پاس ایک کاغذ پڑا ملا جس پر یہ اشعار درج تھے ؎

قل لاخوان رأونی میتا فبکونی و رثونی حزنا !!
أتظنونی بأنی میتکم لیس هٰذا المیت واللہ انا
احمد اللہ الذی خلّصنی و بنیٰ لی فی المعالی مسکنا

لا تظنوا الموت موتا انہ لیس الا نقلۃ من ھا ھنا

(ترجمہ) میرے بھائیوں سے کہو جو مجھے مُردہ پاکر رنج وغم کی وجہ مجھ پہ روتے اور اظہارِ تاسف کرنے لگے ہیں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مَیں مر گیا ہوں، خدا کی قسم مَیں مرا تو نہیں۔ بَیں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے دنیا کے مصائب سے نجات دلائی اور میرے لیے بلندیوں میں ایک مسکن تعمیر کیا بھائیو موت کو موت نہ سمجھو، یہ تو یہاں سے عالمِ آخرت کی طرف محض منتقل ہونا ہے۔

موت کے بارے میں یہ خوشگوار تصور خاصانِ اُمّت کے ہاں ہی نہیں ملتا بلکہ عام اہلِ امت بھی اسی احساس سے سرشار پائے گئے ہیں۔ ایک بدّو کا مرض شدت اختیار کر گیا تو لوگ کہنے لگے اب تو آپ مر جائیں گے۔ اُس نے پُوچھا موت کے بعد مَیں کہاں جاؤں گا؟ وہ بولے اللہ کے پاس۔ اس پر بدو نے کہا تو پھر خوف کس بات کا؟ اللہ ہی تو وہ ہستی ہے جو خیر و عافیت کا مصدر و منبع ہے۔

مولانا جلال الدین رومیؒ سِرّ موت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ خرابی و ویرانی کے بغیر آبادی نہیں ہوتی۔ نہ اچھی طرح کھدائی کیے بغیر قیمتی خزانہ ہاتھ لگتا ہے۔ اِسی طرح پھُولوں کی ہستی فنا ہو تو پھلوں کو حیات ملتی ہے بعینہٖ روح کی تقویت اور بالیدگی اور اسے لباس جدید عطا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ موجودہ جسدِ خاکی فنا کر دیا جائے اور یہ موت کے بغیر ممکن نہیں۔ مزید برآں کسی نعمت کو سلب کرنے کے بعد اللہ کی صفتِ جود و سخا کا تقاضا یہ ہے کہ اُس سے بڑی نعمت عطا کرے۔ پس اگر وہ دنیائے فانی کی حیاتِ ناپائدار سلب کرتا ہے تو کچھ اِس لیے نہیں کہ اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فنا کر دے بلکہ اِس لیے کہ حضرتِ انسان کو اِس سے بہت بہتر حیاتِ جاوید عطا کرے۔

مومن کو جن ذرائع سے اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک کا نام امید ہے۔ یہ وہ احساس ہے جو زندگی کی شبِ تاریک کو منور کرتی ہے اور زندگی کی خوفناک اور پُر پیچ گزرگاہوں میں انسان کو عمل کی صاف سیدھی شاہراہ دکھاتی ہے شجرِ زندگی کو اس سے بالیدگی ملتی ہے۔ تمدن کا عظیم الشان قصر اپنی تعمیر کے لیے اس کا رہینِ منّت ہے اور اسی کی بدولت سعادت و خوش بختی کا مزہ قائم رہتا ہے۔

امید انسان میں عمل کا داعیہ پیدا کرتی ہے، اور مداومتِ عمل پر اسے اُبھارتی رہتی ہے۔ کاہل کو چُست اور چُست کو اور زیادہ سرگرمِ عمل بنا دینا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ کسان کو جو چیز دن رات کھیت میں خون پسینہ ایک کرنے پر مجبُور کرتی ہے وہ اچھی فصل کی امید ہے۔ تاجر خطرناک سفر اختیار کرتا ہے تو نفع کی امید پر۔

طالب علم کبھی محنت نہ کرتا اگر اسے کامیابی کی امید نہ ہوتی۔ ایک سپاہی اگر شجاعت و جوانمردی کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہے تو اس کا محرک فتح و ظفر مندی کی امید کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے۔ مریض کڑوی کسیلی دوائیں خوشی خوشی کھا لیتا ہے تو اس کی وجہ بھی صحت یاب ہونے کی امید ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک بندۂ مومن اگر خواہشِ نفس کی مخالفت اور اپنے پروردگار کی ہر حالت میں اطاعت کرتا ہے تو اس عمل کے پیچھے بھی یہ امید ہی کارفرما ہوتی ہے کہ اسے اپنے پروردگار کی رضا اور خوشنودی حاصل ہوگی، اور وہ اس کے انعاماتِ فراواں کا مستحق ٹھہرے گا۔ غرض یہ کہ ع ما اضیق العیش لولا فسحۃ الامل۔ "زندگی کتنی تنگ ہوتی اگر عمل نے اس کا دائرہ کشادہ نہ کر دیا ہوتا"۔ اس کے مقابلے میں نا امیدی ہے جو سینے میں روشن شعلۂ امید کو بجھا دیتی ہے۔ اور حرکت و عمل کے تمام اسباب و دواعی کو یکسر ختم کر دیتی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: "ہلاکت کا باعث دو چیزیں ہیں ناامیدی اور تکبر"۔ امام غزالیؒ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کو جمع اس لیے کیا گیا ہے کہ حصولِ سعادت سعی و طلب اور کوششِ مزید کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن مایوس آدمی نہ عمل کرتا ہے نہ مطالبہ اور مغرور و متکبر انسان تھوڑی سی کوشش کو بھی کافی سمجھ بیٹھتا ہے۔ نتیجۃً دونوں ناکام رہتے ہیں۔ اور یہ ناکامی وہ چیز ہے کہ جس کے ڈانڈے ہلاکت سے جا ملتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ زندگی اور سعادت سے ہمکنار زندگی کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ پُر امید ہے۔

یاس اور کفر لازم و ملزوم ہیں یاس کا عنصر سب سے زیادہ منکرینِ خدا اور کفار میں پایا جاتا ہے یا پھر ان لوگوں میں جن کا ایمان بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کافر صرف اپنے بل بوتے پر جیتا ہے اور اس کی نظر مادی وسائل پر ہی ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس عظیم کارخانۂ قدرت میں ایک انسان کی اوقات ہی کیا ہے؟ اور اس کے اپنے وسائل کی حیثیت کیا؟ جن وسائل کو اس نے سب کچھ سمجھ رکھا ہوتا ہے وہ بہت جلد جواب دے جاتے ہیں تو ان کے بعد پھر مایوسی ہی مایوسی ہوتی ہے۔ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ (یوسف: ۸۷) پھر چونکہ کافر کا اپنے خدا کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا، بنا بریں اسے مایوسی سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی پس جو شخص جتنا زیادہ مایوس ہوگا اتنا ہی بڑا کافر ہوگا اور جس کا کفر انتہا درجہ کا ہوگا اس کی مایوسی بھی بلانہایت ہوگی۔

مایوسی کے لوازم میں کفر کے علاوہ شک بھی ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے وجود اور یوم حساب میں شک رکھتا ہے اس کے حکیم اور عادل ہونے کا پورا یقین نہیں رکھتا۔ اس کا دامن بھی امید سے تہی ہوتا ہے۔ اسے نہ لوگوں سے خیر کی امید ہوتی ہے، نہ اس کائنات سے نہ خود زندگی سے۔ وہ سیاہ عینک کے ساتھ دنیا کو دیکھتا ہے۔ اس وجہ سے اسے ہر چیز سیاہ اور شر و فساد سے مملو نظر آتی ہے۔ اسے روئے زمین ایک جنگل اور اس میں

بسنے والے انسان وحشی اور درندے دکھائی دیتے ہیں۔ اس تناظر میں اسے زندگی ایک ناقابلِ برداشت بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر زندگی کے بارے میں قائم کرکے ابوالعلاء معری نے یہ شعر کہا ہوگا ؎

هٰذا جَنَاهُ اَبِي عَلَيَّ وَمَاجَنَيْتُ عَلٰى اَحَد

یہ میری زندگی ایک ایسا جرم ہے جو میرے باپ سے سرزد ہوا۔ لیکن میں نے ایسا جرم کسی پر نہیں کیا۔ یعنی میں کسی کی پیدائش کا سبب نہیں بنا۔

ایمان امید کو جنم دیتا ہے | جس طرح یاس اور کفر لازم و ملزوم ہیں اسی طرح اُمید اور ایمان بھی متلازم ہیں۔ چنانچہ ایک ایماندار سب سے زیادہ پُر امید اور خوش گمان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان نام ہی اُس اعلیٰ اور عظیم طاقت کو تسلیم کرنے کا ہے جو اس کائنات کا انتظام کر رہی ہے۔ جس سے کوئی چیز مخفی نہیں اور جو کسی کام سے عاجز نہیں۔ ایسی ہستی، جو ہر مجبور و مضطر کی پکار سُنتی ہے، جواب دیتی ہے اور اس کی مصیبت کو دُور کرنے کی پُوری پُوری صلاحیت رکھتی ہے، کو ماننے والا ناامید کیسے ہو سکتا ہے۔

وہ اللہ جو اپنے بندوں پر اُس سے کہیں زیادہ مہربان ہو جتنی کہ ماں بچے پر ہوتی ہے۔ وہ اللہ جو دن کے وقت جرم کرنے والوں کو معاف کرنے کے لیے رات کو انہیں اس بات کے لیے پکارتا ہو کہ وہ آئیں اور اس کی بارگاہ میں عفو طلب کریں۔ وہ اللہ جو گنہگار کو آمادۂ توبہ و انابت دیکھ کر اُس سے زیادہ خوش ہوتا ہو جتنا صحرائے لق و دق میں اپنے سر و سامان اور سواری کو گم کرنے والا قریب المرگ مسافر، سواری کو اچانک سامنے پا کر خوش ہو سکتا ہے۔ وہ اللہ جو ایک نیکی کا بدلہ سات سو نیکیوں کے برابر دیتا ہو اور بدی کا بدلہ صرف ایک ہی بدی کے برابر دے یا بالکل ہی معاف کر دے۔ وہ اللہ جو اعراض کرنے والے کو قریب سے بلاتا ہو اور رجوع کرنے والے کی طرف دُور سے توجہ دیتا ہے ـــــ اُس اللہ پر ایمان کیا امید کو جنم نہ دے گا۔ خیر و عافیت کی امید کو، عفوِ تقصیر کی امید کو، حسن انجام کی امید کو اور ابدی و سرمدی سعادت کے حصول کی امید کو۔

مومن اور مادہ پرست کی امیدوں کا فرق | مومن کی امید و رجا کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی کیونکہ اُس کے ربِّ رحیم کے فضل و کرم اور رحمت کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ مزید برآں اُس کی امید کوئی خام اور ناپختہ قسم کی امید نہیں ہوتی بلکہ نہایت مضبوط اور ناقابلِ شکست ہوتی ہے۔ وجہ ظاہر ہے وہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اُس کے ساتھ۔ وہ اللہ کے لیے جی رہا ہوتا ہے اور اللہ اُس کے لیے اپنی لامحدود طاقت وقف کر دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد امید ٹوٹنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟

مومن جب لڑتا ہے تو فتح کی مضبوط اُمید کے ساتھ لڑتا ہے وَاِنَّ جُنْدَنَا لَھُمُ الْغَالِبُوْنَ ۔ وہ بیمار ہو جاتا ہے تو صحت کی پختہ امید کے ساتھ مرض کا مقابلہ کرتا ہے وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ ۔ اُس سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو امیدِ مغفرت کا دامن اُس کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا ۔ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ۔ اُس پر تنگی اور مشکلات کا زمانہ آجائے تو وہ کشائش اور فراخی کی امید رکھتا ہے اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۔ وہ کسی حادثہ کا شکار ہو جائے تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے ہوئے اللہ سے اجر کا امیدوار ہوتا ہے ۔ اُولٰٓئِكَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ ۔ وہ پیر فرتوت بھی ہو جائے تو اُسے اولاد کی امید رہتی ہے ۔ وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا ۔ اور وہ دنیا میں کفر و باطل کا غلبہ دیکھتا ہے تو کبھی یاس و قنوط کا شکار نہیں ہوتا بلکہ استیلائے حق اور زوالِ باطل کی امید قائم رکھتا ہے اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَھُوْقًا ۔

مادہ پرست ظاہری اسباب پر نظر رکھتے ہیں اور ان کے پیچھے کارفرما اللہ کی عظیم طاقت کو تسلیم نہیں کرتے مگر خدا پرست اسباب و وسائل کو اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ نظر صرف خدا پر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مادہ پرست جب نا امید ہو جاتے ہیں اور اُن پر دنیا باوجود فراخی کے تنگ ہو جاتی ہے تو خدا پرستوں پر دائرہ پھر بھی کشادہ ہی رہتا ہے ۔ مومن کی بیماری کو طبیب لاعلاج قرار دیتے ہیں تو وہ مایوس نہیں ہوتا بلکہ خدا سے اُمیدِ شفا قائم رکھتا ہے ۔ اُس کی پریشانی و محرومی اور اُس کی مظلومیت کا کوئی مداوا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے فکر کی کوئی بات نہیں ہوتی وہ خدا کو ہر آن اِس قابل سمجھتا ہے کہ اُس پر ہونے والے ظلم کا ازالہ کر دے اور اُس کی پریشانی کو دُور فرما دے ۔ سیدنا ابراہیم اور حضرت زکریا علیہما السلام ظاہری اسباب کے لحاظ سے قطعاً اس قابل نہ تھے کہ اُن کو اولاد عطا ہو سکتی، مگر دنیا نے دیکھا کہ وہ نعمتِ اولاد سے ہمکنار ہوئے ۔ حضرت یونس اور حضرت ایوب علیہما السلام پر ابتلا کی ایسی گھڑیاں آئیں کہ جن میں کوئی ان کے لیے کچھ نہ کر سکتا تھا مگر وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے ، اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی گوہرِ مقصود عطا کر دیا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر جا رہے تھے ، ساحلِ سمندر پر پہنچ کر دیکھا تو پیچھے فرعون کے لشکر تھے اور آگے سمندر کے تند و تیز تھپیڑے مگر حضرت موسیٰ کو اپنے رب کی قدرتِ کاملہ کا یقین محکم تھا اور بنی اسرائیل کی نجات کی پوری امید تھی ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کو پایاب بنا کر حضرت موسیٰ اور ان کی قوم کو تو ظالموں کے تسلط سے آزادی بخشی ، دوسری طرف فرعون کو ، لشکر سمیت غرق کر دیا

تاریخ کے یہ وہ واقعات ہیں جو ہر شک و شبہ سے بالاتر ہیں مگر مادہ پرست ان میں سے بعض کا یا

سب ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کا وقوع ان کے خیال میں معلوم اور معتاد اسباب کے ماتحت نہیں لیکن اہلِ ایمان تو سمجھتے ہیں کہ ظاہری اسباب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کو محدود نہیں کر سکتے۔ ان اسباب کے بندوں سے کوئی پوچھے کہ اگر معتاد اسباب ہی اصل حقیقت ہوتے ہیں اور ان کے خلاف یا ان سے بالا کسی چیز کے بارے میں کچھ سوچنا اور بولنا غیر معقول ہے تو کیا اس طرزِ فکر کے ساتھ کسی قسم کی علمی ترقی ممکن ہے۔ کیا معتاد اسباب کے مقلد بن کر ہم ایٹمی اور خلائی دور میں داخل ہو سکتے تھے۔ اگر قدیم زمانہ کا تانگہ بان یہ کہتا کہ آمد و رفت کا ذریعہ تو بس یہ تانگے اور رتھیں وغیرہ ہی ہیں، ہوائی جہاز میں بیٹھ کر سفر کرنا تو کسی طرح ممکن ہی نہیں، کیونکہ یہ معتاد اسباب کے خلاف بات ہے تو کیا تانگہ بان کی اس بات کو درست تسلیم کر لیا جاتا۔ اگر نہیں تو مادہ پرستوں کی خدا کے معاملے میں یہ جسارتیں کیسے درست ہو سکتی ہیں۔

امید زندگی کے لیے ناگزیر ہے اگر امید کا وجود نہ ہوتا تو آج علمی ترقیات کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ اہلِ علم و ایجاد اپنے زمانہ کے ثابت شدہ امور سے آگے صرف اس امید پر قدم بڑھاتے رہے کہ وہ نامعلوم حقائق کو دریافت کریں گے اور زندگی کی بہتر سے بہتر سہولتیں فراہم کر سکیں گے۔ چنانچہ جب انہوں نے دامنِ امید پکڑ کر جد و جہد کا آغاز کیا تو کامیابی نے ان کے قدم چومے۔

داعیانِ حق، مصلحینِ امم اور تحریکوں کے بانی اگر اس امید سے سرشار نہ ہوتے کہ ان کا مشن کامیاب رہے گا تو کیا وہ میدانِ عمل میں کودتے؟ اور اگر بے دلی کے ساتھ کود بھی پڑتے تو کیا ان کی حیثیت ان سپاہیوں کی سی نہ ہوتی جو اسلحہ کے بغیر محاذِ جنگ پہ پہنچ جائیں۔ ایسی سپاہ کا مقدر فتح و نصرت تو نہیں ہو سکتا۔

عام زندگی کے معمولات میں اگر امید ہمرکاب ہو تو مشکل کام آسان اور بعید چیز قریب ہو جاتی ہے لیکن مایوسیاں آدمی کو گھیر لیں تو آسان ترین کام بھی مشکل دکھائی دیتے ہیں۔ اور قریب الحصول مقاصد ناممکن نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ عظیم الشان تمدن، پرشکوہ ادارے آمد و رفت کے حیرت انگیز وسائل اور رواں دواں حیات کے جملہ مظاہر امید ہی کے تو متعدد کرشمے ہیں۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہادیٔ برحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔ آیئے ذرا اس امر کا جائزہ لیں کہ اس میں امید کس حد تک جلوہ گر نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے آپ تیرہ سال تک مکہ میں دعوتِ اسلام دیتے رہے۔ طنز و طعن، تضحیک و استہزاء، شدید مخالفت، ظلم و تشدد اور مقاطعہ تک نوبت پہنچی اور آپؐ اپنے پیروؤں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دینے پر مجبور ہو گئے، لیکن آپ نے حوصلہ

نہیں ہارا اور شعلۂ امید برابر آپ کے سینے میں روشن رہا۔ حضرت خباب بن الارت جن کا آقا لوہے کی سلاخیں گرم کرکے اُن کی پُشت کو داغ دیتا تھا رسولِ پاک کے پاس آتے ہیں اور بے پناہ مصائب اور ناقابل برداشت اذیتوں کی شکایت کرتے ہوئے آپ سے کافروں کے لیے بدُعا کی درخواست کرتے ہیں تاکہ ان کو قومِ عاد و ثمود کی طرح تباہ و برباد کرڈالا جائے۔ مگر چہرۂ رسالتمآب اِس درخواست سے اُلٹا متغیر ہوجاتا ہے۔ آپ حضرت خبابؓ کو صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہیں اور مستقبل کی کامیابی کی امید کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں" اے خبابؓ تم سے پہلے حق و صداقت کے علمبرداروں کو لوہے کے آروں سے دولخت کردیا جاتا تھا مگر انہیں کوئی راہِ راست سے منحرف نہ کرسکا۔ خدا کی قسم یہ دین ضرور غالب ہوکر رہے گا اور ایک تنہا سفر کرنے والا صنعا سے حضرموت تک جائیگا اور اللہ کے سوا اسے کسی کا خوف نہ ہوگا مگر تم لوگ جلد بازی سے کام لیتے ہو" غور فرمائیے اس سنگین صورتِ حال پر استقامت کے پیچھے کیا شے کارفرما ہے اور ان ارشادات کے پسِ پردہ کیا چیز بول رہی ہے۔

پھر نبی آخر الزماں اور آپ کے تمام پیرو مدینہ کی طرف ہجرت کرجاتے ہیں۔ ہجرت کے موقع پر آپ کا تعاقب کیا جاتا ہے اور آپ کے پیروؤں کو تنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مگر کسی کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آتی۔ مدینہ پہنچ کر بھی مسلمانوں کو چین نہیں لینے دیا جاتا۔ نت نئی جنگوں اور آئے دن کی جھڑپوں سے سابقہ پیش آتا ہے حتیٰ کہ ایک موقع پر پورا عرب مدینہ کی چھوٹی سی آبادی پر پل پڑتا ہے۔ مدینہ کے اندر یہود اور منافقین کی ریشہ دوانیاں اس پر مستزاد ہیں۔ اس موقع پر جب قرآن کے الفاظ میں خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور کلیجے منہ کو آگئے تھے، کیا اللہ کی نصرت کی امید کے علاوہ کوئی اور چیز تھی جس نے مسلمانوں کو سہارا دیا۔

مختصر یہ کہ دنیا کے اس عظیم داعی حق صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت پرخطر اور مشکل زندگی میں جو چیز قدم قدم پر ولولہ تازہ دیتی نظر آتی ہے۔ ہر آن حوصلہ بڑھاتی اور مزاحمت و مدافعت پر مسلمانوں کو ابھارتی ہے اور بالآخر نسبتاً کم وسائل رکھنے کے باوجود ابتداءً عرب کے وسیع و عریض علاقے پر اور بعد ازاں چار دانگِ عالم میں اُن کی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیتی ہے وہ امید ہے صرف امید ۔ اللہ کے بے حد و حساب انعام و اجر کی امید۔ شہادت و فتح مندی کی امید اور تائید و نصرتِ الٰہی کی امید۔